اُردو میں نسائی مکتوب نگاری کی روایت

ڈاکٹر عصمت جمیل

Abstract

Traditionally, women's participation in literature was looked down upon. However with the changing world, this outlook also underwent a gradual change as a group of men took up cudgels to fight for women's rights. Women also started contributing to literature in their own names and this led to a free vent of women's feelings and thoughts in fictitious letters. Society gradually accepted this development, until a time came when some literary men's letters were published which were addressed to women. Now when women have entered the field of literature, they are actively contributing to the genre of novel, short story, poetry and criticism. It is high time that women's correspondence should be published along with their literary references.

کوئی بھی زبان اپنی قوم کے طرز فکر کی نمائندگی کرتی ہے جب یہ طرز فکر مختلف اصناف میں ڈھلتا ہے تو محسوسات کے ہفت رنگ پیش کرتا ہے۔خاص طور پر جب یہ صنف خط کی شکل میں ہو تو نجی، ذاتی، ماحولیاتی، علاقائی، تاریخی زمان و مکان کا اہم حوالہ بن جاتی ہے اور اگر لکھنے والا فن کار ہو تو فن اور شخصیت کے ملاپ سے ایسے شاہکار تخلیق ہوتے ہیں جو کلاسیکی درجہ رکھتے ہیں۔

اُردو زبان کی کہانی بھی عجیب ہے اس کی تخلیق میں برصغیر کی تمام قوموں نے حصہ لیا۔مسلمان حکمرانوں کی سرکاری زبان چوں کہ فارسی تھی اس لیے اُردو کو ایک خودرو پودے کی حیثیت حاصل رہی لیکن جب انگریزی حکومت کا قیام ہوا اور یہ نظر آنے لگا کہ آئندہ حکومت گنتی (جمہوریت) کی بنیاد پر ہوگی تو ہندو اکثریت نے اپنی الگ شناخت بنانے کی خاطر اپنی مردہ زبان سنسکرت کو دوبارہ زندہ کیا اور ایک زندہ زبان اُردو کی اہمیت کو کم کرنے کی کوشش کی۔لیکن اس وقت تک اس میں اتنا ادب تخلیق ہو چکا تھا جو اس کی زندگی کی ضمانت بن سکے چنانچہ اُردو زبان میں تمام اصناف میں اتنا ذخیرۂ ادب موجود ہے اور اس پایے کا ہے کہ اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔اُردو مکتوب نگاری کی تاریخ کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ مغلوں کے دورِ آخر میں اُردو کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کے پیش نظر مکوتب نگاری بھی اُردو میں ہونے لگی تھی لیکن اُردو چونکہ فارسی اور عربی کے زیرِ سایہ پرورش پا رہی تھی اس لیے اُردو خطوط تشبیہات و استعارات سے مرصع اور مشکل پسندی کا دامن تھامے ہوئے ہیں، اُردو انشاء کا یہ طرز کم و بیش انیسویں

صدی کے وسط تک جاری رہا۔اس وقت میرا موضوع اُردو کے نسوانی خطوط ہیں جن کا پہلا نمونہ ریاست اودھ کے حوالے سے ملتا ہے۔ واجد علی شاہ کو جب انگریزوں نے ریاست اودھ سے بے دخل کر کے مٹیا برج اور پھر فورٹ ولیم کلکتہ میں قید کر دیا تو واجد علی شاہ نے اپنی بیگمات کو جو خطوط لکھے اور ان کے جو جواب آئے وہ اردو خطوط نویسی کا پہلا پڑاؤ ثابت ہوئے۔

واجد علی شاہ کو رقص و موسیقی اور اداکاری کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف کا بھی شوق تھا۔ اس کی نثری تالیفات میں مکتوبات کے کچھ مجموعے بھی شامل ہیں۔ یہ خطوط کلکتہ سے ان محلات و بیگمات کو لکھے گئے جو لکھنؤ میں مقیم تھیں۔ خطوط کی اس آمدورفت نے نفسیاتی اعتبار سے اختر کو اس قید تنہائی میں بڑا سہارا دیا۔ یہ مراسلات بنیادی طور پر نجی نوعیت کے ہیں لیکن ان سے اُردو کے مکتوباتی اور حسیاتی ادب میں معتد بہ اضافہ ہوا، بعد میں خطوط کی اس قسم میں سیّد سجاد ظہیر کے رضیہ سجاد ظہیر کے نام خطوط ''نقوش زنداں'' اور فیض احمد فیض کے خطوط ایلس فیض کے نام ''صلیبیں میرے دریچے میں'' سے اضافہ ہوا۔ محمد اکرم چغتائی لکھتے ہیں:

> ''اب تک ان مکاتیب کے جتنے مجموعے دستیاب ہوئے ہیں وہ سب واجد علی شاہ کی اپنی فرمائش پر ترتیب دیئے گئے وہ اپنی جن بیگمات کو خطوط لکھتا تھا وہ انھیں محفوظ رکھتی تھیں بعد میں اختر نے ہر بیگم کو یہ تاکید کی کہ وہ ان خطوط کو خوبصورت انداز میں بشکل کتاب اسے ارسال کرے چنانچہ تمام مکتوب الیہ بیگمات نے اس کی خواہش کا احترام کیا انھیں تجربہ کار خوشنویسوں سے لکھوایا اور مصوروں نے ان کی تزئین و آرائش میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی اور پھر انھیں واجد علی شاہ کے حضور پیش کر دیا۔''[1]

ان مجموعوں کے ناموں میں لفظ تاریخ لازماً استعمال ہوا ہے جب کہ دوسرا لفظ اس بیگم کا نام ہے جسے وہ خطوط لکھے گئے تھے مثلاً تاریخ ممتاز، تاریخ مشغلہ، تاریخ نور، تاریخ جمشیدی وغیرہ ایسی تقریباً نو کتابیں ہیں۔ یہ بیگمات بھی پابندی سے اسے خط لکھتی تھیں۔ جس کے لئے وہ اکثر و بیشتر منشیوں کی خدمات حاصل کرتی تھیں۔ اس قسم کے دو مجموعے دستیاب ہیں۔ ایک ''گلدستہ محبت'' کے نام سے ہے جس میں نواب آراستہ بانو فریدوں بیگم کے بائیس خط ہیں دوسرے مجموعے کا عنوان ''افسر التواریخ'' ہے جس میں نواب جمشید بیگم کے تحریر کردہ سینتالیس خطوط جمع ہیں۔ ان دونوں کے محفوظ رہنے کی وجہ یہ ہے کہ واجد علی شاہ نے خود ۱۲۷۵ھ میں انھیں ترتیب دیا بعد میں بھی بعض لوگوں

نے واجد علی شاہ اوراس کی بیگمات کے خطوط مرتب کئے۔اس عرصے میں دو مجموعے سامنے آئے ہیں۔ایک کا عنوان ''مخزن اسرارِ سلطانی معروف بہ رُقعات بیگمات'' ہے اس کو محمد امتیاز علی خان نجیب فرخ آبادی نے مرتب کیا۔ یہ مجموعہ فرخ آباد سے ۱۹۰۴ء میں طبع ہوا۔اس طرح کا دوسرا مجموعہ ''بیگماتِ اودھ کے خطوط'' ہے۔ یہ مجموعہ انتظام اللہ شہابی اکبرآبادی نے ترتیب دیا۔

ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی لکھتے ہیں:

> ''خط لکھنے کے لیے کاغذ اور قلم ہی کی نہیں خونِ جگر کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ جانِ عالم اوران کی بیگمات کے خطوں میں حسرتوں کی سرخی ہے جذبات کی گھٹا ہے، ارمانوں کا سوگ ہے، ان میں دلی کیفیات کا اظہار ہے، لیکن ایسا بے لاگ جیسے تیر کمان سے نکل جائے۔ یہ خطوط صرف تاریخ کے ہی طالب علم کے لیے اہم نہیں مکتوباتی ادب میں بھی درجہ رکھتے ہیں۔''[2]

تاریخ ممتاز میں بیگم اکلیل محل لکھتی ہیں:

> ''یکا یک اوپر ضمیر فیض منیر جناب عفت مآب کے آیا کہ محبت نامجات کہ جو ہمارے سلطانِ عالم و پیارے جان عالم زید اللہ حسنہٗ و جمالہٗ ملکہ وسلطنتہ نے جو خود عنایت بے غایت ہم کو بھجوائے ہیں اگر وہ درمعانی و گوہر سخندانی سلسلہ تحریر میں مثل انشاء کے مسلسل ہوں پس وقت تنہائی و جدائی میں تشفی بخش عاشقۂ اکمل ہوں اور تا قیامت حسن دل افروز جانِ عالم ادام اللہ محبت کا شہرہ اور ہمارے عشق صادق کا مثل شیریں وزلیخا کے چرچا تا قیام روز قیام قائم رہے۔''[3]

ریاست اودھ پر قبضے کے دس سال بعد کے عرصے کے اندر انگریز تقریباً تمام برصغیر پر قبضہ جما کر ماحول میں تبدیلی کی خبر دے رہے تھے۔ادب درباروں سے نکل کر عام آدمی کو بھی موضوع بنانے لگا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مولوی نذیر احمد اور دوسرے حکومت کی سرپرستی میں عورتوں کی راہنمائی اور تعلیمی ضروریات کے لیے کتابیں ترتیب دے رہے تھے۔منشی سیّد احمد دہلوی (مؤلف فرہنگِ آصفیہ) نے عورتوں کی راہنمائی کے لیے ایک مجموعہ خطوط ترتیب دیا جو پہلی مرتبہ ''ہادی النساء'' کے نام سے ۱۸۷۵ء میں شائع ہوا۔جس کا ساتواں ایڈیشن ۱۹۷۳ء میں پروفیسر حمید احمد خان ناظم مجلس ترقی ادب لاہور نے شائع کیا ہے۔

یہ نمونے کے خطوط ہیں جن میں ماں، باپ، بھائی، بہن، زن وشوہر، عزیز واقربا سہیلیوں، نوکروں، چاکروں، کاروباری لوگوں اور عمال حکومت کے نام خطوط اور عرضیاں ہیں جو اس زمانے کی تہذیب وتمدن لال حویلی اور شرفاء کا طرز معاشرت، رسم ورواج، خانہ داری، بچوں کی پرورش، دوادارو، تعلیم وتربیت، خانگی امور، شادی غمی کی تقاریب، نوک جھونک، غرض اس زمانے کی ایک متحرک تصویر پیش کرنے اور اس وقت کی نئی نسل کو تعلیم دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ جب یہ کتاب لکھی گئی تھی کم وبیش اسی زمانے میں خطوط وانشاء کے مجموعوں کی اشاعت کا بازار گرم تھا۔ مرزا غالب کے خطوط کا پہلا مجموعہ ''عودِ ہندی'' ۱۸۶۸ء شائع ہو چکا تھا۔ مولوی نذیر احمد کی ''مراۃ العروس'' (۱۸۶۸ء) اور ''توبتہ النصوح'' (۱۸۷۷ء) جیسی تعلیمی وترغیبی کتابوں کا طوطی بول رہا تھا۔ گارسان دتاسی نے اس کتاب کے بارے میں لکھا:

> ''سیّد احمد دہلوی نے خاص طور پر عورتوں کے لیے ''انشائے ہادی النساء'' نامی ایک کتاب لکھی ہے اس کا انداز تحریر مصنف کے سلامت ذوق کا ثبوت ہے۔ انھوں نے بیگماتی اُردو کی بہترین مثال پیش کی ہے۔''[4]

پہلے ایڈیشن کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے عورتوں کے خطوط عورتوں کے نام کے علاوہ مردوں کے نام بھی تحریر کیے اور اس کا نام ''تحریر النساء'' رکھا بعد میں دونوں حصے یکجا کر دیئے گئے۔ منشی سیّد احمد دہلوی خود اپنی اس کاوش کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''مؤلف کو بھی اس کی کاوشوں کے صلے میں یو پی و پنجاب کی حکومت اور حضور نظام کی سرکار نے انعامات سے نوازا ہے۔ ان قدر شناسوں کی بدولت بارہا اسے یہ تحریک ہوئی کہ اس رسالے کو پیش کرے جن میں بطرز خطوط اور جوابات خط اس نے ہندوستانی مسلمان عورتوں کی وہ زبان پیش کی ہے جس سے وہ اپنے طور پر آگاہ ہے یہ زبان ایسی ہے جو ہماری خواتین آپس میں استعمال کرتی ہیں مصنف کو یہ احساس بھی ہے کہ اس کے کام پر ناک بھوں چڑھائی جائے گی، اعتراض وارد ہوں گے اور کہا جائے گا (گو غلط سہی) کہ اس نے ایک ایسے میدان میں قدم رکھا ہے جس پر آج تک کسی نے چلنے کی سعی نہیں کی تھی اور یہ کہ اس نے ایک ایسے موضوع کو چھیڑا ہے جسے اپنی جگہ ہی رہنا چاہیے تھا۔ ان

باتوں کے احساس کے باوجود وہ طعن اوراعتراض سہنے کے لیے تیار ہے کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ اس نوع کی تحریریں عورتوں میں فروغ تعلیم کا سبب بنیں گی۔'' [5]

مغلوں کی حکومت ختم ہونے سے ایک تہذیب کا خاتمہ ہوگیا۔ انگریزوں نے زمام اقتدار سنبھالی تو یہاں کی اقوام کو نئی تعلیم کی ضرورت کا شدید احساس ہوا کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ انگریزوں کا مقابلہ ان کے علم و ہنر کو سیکھ کر ہی ہو سکتا ہے اس لیے جدید تعلیم کے حصول کی شعوری کوششوں کا آغاز ہوا۔ مرد اگر جدید تعلیم سے سو سال پیچھے تھے تو عورتیں دو سو سال پیچھے تھیں۔ اس وقت کی تعلیمی حالت کے بارے میں لکھا ہے کہ:

''اگر پڑھنے کی طرف توجہ بھی کی تو کیا پڑھے ''فسانۂ عجائب'' یا ''قصّہ حاتم طائی'' دوسرے تعلیم نسواں کے بڑے دشمن۔ نہ آپ پڑھیں نہ انھیں پڑھنے دیں۔۔۔۔ ہندوستان کی عورتیں گو خوبصورت اور پاکیزہ شکل میں مگر جہالت کے سبب بے تمیز رہتی ہیں اور بے تمیزی سے ناگوار معلوم ہوتی ہیں۔'' [6]

چنانچہ دردمند مصلحین قوم نے عورتوں کو تعلیم فراہم کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ یورپ کی سائنسی وفکری خاص طور پر بیداریٔ نسواں کی تحریکیں عورت کی معاونت کو آگے بڑھیں لیکن عورت اس قدر پسماندہ تھی کہ وہ اس معاونت کو خوش آمدید کہنے کے ہی قابل نہ تھی۔ جدوجہد، احتجاج یا بغاوت تو بہت دور کی چیزیں تھیں۔ معاشرہ طرح طرح کے خدشات کا شکار تھا مولوی نذیر احمد لکھتے ہیں:

''مصیبت یہ ہے کہ اکثر لوگ عورتوں کے لکھانے پڑھانے کو عیب اور گناہ خیال کرتے ہیں ان کو خدشہ یہ ہے کہ ایسا نہ ہو کہ لکھنے پڑھنے سے عورتوں کی آنکھیں چار ہو جائیں۔ غیر مردوں سے خط و کتابت کرنے اور خدانخواستہ کل کلاں کو ان کی پاک دامنی اور پردہ داری میں کسی طرح کا فتور واقع ہو۔'' [7]

گھریلو زندگی کو آسودگی سے چلانے کے لیے مولوی نذیر احمد نے اپنی تقریباً تمام تحریروں میں عورتوں کو تعلیم دلانے کی وکالت کی۔ 'مراۃ العروس' ہو یا 'فسانۂ مبتلا'۔ 'ایامیٰ' ہو یا کوئی بھی دوسری تحریر وہ ہر جگہ نسوانی تعلیم کی تبلیغ کا موقع ڈھونڈ نکالتے ہیں ''ایامیٰ'' میں لکھتے ہیں:

''لیاقت کا تو یہ حال ہے کہ اگر کسی بدنصیب خانہ دار کو سفر درپیش آ گیا تو جتنے دن سفر میں گزرے بیوی رانڈ اور میاں رنڈوے۔ دل کی بات نہ یہ لکھ سکتا ہے اور نہ

یہی لکھ سکتی ہیں۔‘‘[8]

ان حالات نے ایک ذہنی انقلاب کی راہ ہموار کی۔ مفکروں، ادیبوں، شاعروں، مصلحین قوم کی کوششوں اور خود حکومت کی سر پرستی نے عورتوں کو لکھنے پڑھنے کی طرف راغب کیا۔اس کے لیے اجازت سے لے کر وسائل کی فراہمی تک کے تمام مدارج درپیش ہوئے۔ بہرحال جب عورتیں فقط لفظ پہچاننے کے قابل ہوئیں تو انھوں نے والدہ افضل علی طرز کے ناموں کے ساتھ زنانہ رسالوں میں لکھنا شروع کیا۔عورتوں کو دوسری عورتوں کی تعلیم کی غرض سے لکھنے کی طرف مائل کرنے کے لیے بعض رسالوں نے عورتوں کے فرضی ناموں سے بھی کہانیاں لکھیں۔خط بھیجے، رائے بھیجی، لکھنے والیوں کو علمی و ادبی حلقوں میں پذیرائی بھی ملی۔اس پذیرائی کو دیکھتے ہوئے بعض تاریخی سکینڈل بھی سامنے آئے،مثلاً رسالہ ’’نقاد‘‘ کے ایڈیٹر و مالک شاہ دلگیر دو سال تک (۱۹۱۵-۱۹۱۶ء) اس رسالے کو کامیابی سے نکالتے رہے لیکن مالی خسارے کی وجہ سے وہ بد دل ہو گئے اور رسالہ بند کر دیا۔ نیاز فتح پوری جیسے بڑے ادیب بھی اس رسالے کے لکھاریوں میں شامل تھے۔ نیاز فتح پوری نے ایک دو اور لکھاری دوستوں کے تعاون سے شاہ دلگیر کو رسالہ نکالنے پر مجبور کرنے کے لیے ایک منصوبہ بنایا اور ایک فرضی خاتون قمر زمانی بیگم کے نام سے شاہ دلگیر کو رومانی خطوط لکھنا شروع کر دیئے۔ جب خط و کتابت بڑھی تو اس خاتون کے ذریعے رسالہ دوبارہ جاری کرنے کی فرمائش کی گئی اور ساتھ ہی یہ کہا گیا کہ وہ قلمی معاونت بھی کریں گی بلکہ وہ معاون ایڈیٹر کا کردار بھی پردے میں رہ کر کر سکتی ہیں۔ خطوط چونکہ علامہ نیاز فتح پوری کے لکھے ہوئے تھے اس لیے ان کی رومانیت اور تحریر کی خوبصورتی میں کلام نہ ہو سکتا تھا۔شاہ دلگیر تیار ہو گئے اور رسالہ دو سال کی بندش کے بعد دوبارہ جاری ہو گیا۔اب ساری ادبی دنیا اس خاتون کے بارے میں جاننے کے لیے بیتاب ہو گئی۔قدرتی طور پر رسالے کی فروخت میں بھی اضافہ ہوا۔ یہ خطوط اب تاریخ کا حصہ ہیں۔’’نقوش‘‘ خطوط نمبر میں قمر زمانی بیگم اور شاہ دلگیر کے جوابی خطوط خاصے کی چیز ہیں۔لیکن دوڈھائی سال کی شدید پردہ داری کے بعد جب دلگیر کو اس کھیل کا پتہ چلا تو وہ انتہائی خفیف ہونے کے ساتھ ساتھ دلبرداشتہ بھی ہوئے اور کچھ عرصے کے بعد رسالہ ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی کتاب ’’قمر زمانی بیگم‘‘ اس کھیل کی پوری تفصیل بیان کرتی ہے، نہ صرف یہ بلکہ نیاز فتح پوری نے یہ ثابت کرنے کے لیے کہ کچھ اور خواتین بھی اس رسالے میں عملی دلچسپی لے رہی ہیں کچھ اور نسوانی ناموں سے بھی خطوط لکھے۔

’’نیاز فتح پوری نے قمر زمانی بیگم کے علاوہ بعض دوسری خواتین مثلاً کوثر، ناہید،

کہکشاں اور بلقیس وغیرہ کے فرضی ناموں سے بھی نقاد میں کئی انشائیے، افسانے اور خطوط لکھے۔''[9]

لیکن خود نیاز فتح پوری بھی اس کھیل کا شکار ہوئے تقریباً اسی زمانے میں طاہرہ دیوی شیرازی کو خطوط لکھنے اور اس کے عشق میں مبتلا ہونے والوں میں نصیرالدین ہاشمی (دکن میں اردو والے) اور خود نیاز فتح پوری بھی پیش پیش تھے، اس کی تفصیل کچھ یوں ہے:

''طاہرہ دیوی شیرازی کا نام فضل حق قریشی نے اختیار کر کے جو افسانے ''ساقی''، ''نگار'' اور کچھ دیگر رسالوں میں شائع کروائے۔ ایک فرضی تصویر بھی شائع کر دی گئی۔ نیاز فتح پوری اور نصیرالدین ہاشمی اس خاتون کی مدح سرائی اور خط و کتابت میں پیش پیش رہے۔ ''ساقی'' نے ان افسانوں کا مجموعہ ''سحرِ بنگال'' بھی شائع کیا۔ خود شاہد احمد دہلوی (مدیر ساقی) کو اس راز سے آشنائی اس مجموعے کی اشاعت کے وقت ہوئی۔ اس مجموعے کی اشاعت پر عقیدت مندوں کا ایک سیلاب اُمنڈ آیا۔ پاکستان بننے کے بعد ''پردہ اُٹھتا ہے'' کے نام سے ''اردو ڈائجسٹ'' میں قسط وار یہ راز فاش کیا گیا کہ اس کردار کے پیچھے خود فضل حق قریشی تھے، جو ساقی کے معروف لکھاری تھے۔''[10]

اس طرح کے جعلی خطوط کے علاوہ خطوط کی ایک اور قسم بھی ہے جو اس دور میں وجود میں آئی جب عورتوں کے ہاتھ میں قلم موجود نہ تھا۔ ان کے جذبات کی ترجمانی کے لیے بھی خطوط کی صنف کا سہارا لیا گیا۔ اگرچہ یہ خطوط کہیں بھیجے نہ گئے مثلاً سجاد حیدر یلدرم نے اپنے افسانہ ''صحبت ناجنس'' (مشمولہ خیالستان) کے نام سے سلمٰی اور عذرا کے خطوط کی شکل میں کہانی بُنی۔ جو جنسی نفسیات کو بیان کرتی ہے۔ سجاد حیدر یلدرم کے بعد قاضی عبدالغفار نے ''لیلیٰ کے خطوط'' کے نام سے قصہ کہا جو بکنے والی عورت کی نفسیات اور مسائل کو بیان کرتا ہے اور یہ چاہا کہ ان خطوط کو تمثیل کے طور پر پڑھا جائے:

''مجھ پر ظلم ہوگا اگر ان صفحات کو ناول یا افسانہ سمجھ کر پڑھا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کاغذی پیرہن میں خراب آباد ہندو پاکستان کی نسوانی زندگی کے چند نقوش پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اگر اس بدنصیب ملک میں کچھ لوگ ان نقوش

کے معنی سمجھ سکیں تو سمجھ لیں اور یہ بھی سمجھ لیں کہ جس وقت تک ہندو پاکستان کی
عورت کے ساتھ پورا انصاف نہ کیا جائے گا سیاسی آزادی اور قومی ترقی کا ادعا
حرف غلط رہے گا۔''[11]

مردوں کی طرف سے عورتوں کے حق میں خطوط افسانے کی شکل میں ہوں یا خود لکھ کر افسانہ بنایا گیا ہو۔اس کمی کو بہرحال پورا نہیں کرتے ۔ جو عورتوں کے اپنے خطوط کی شکل میں ہوسکتی تھی لیکن ابھی سورج کو کچھ اور گردشیں کاٹنا تھیں۔ابھی معاشرے میں عورت کا کردار اس قابل نہ ہوا تھا کہ اس کے خطوط معاشرتی سطح پر اہم ہوتے ،سیّد عبداللہ کہتے ہیں:

''خط نگاری خود ادب نہیں مگر جب اس کو خاص ماحول خاص مزاج خاص استعداد
اور ایک خاص آن خاص گھڑی اور خاص ساعت میسر آ جائے تو یہ ادب بھی بن
سکتی ہے مگر خط کو ادب بنانے کا کام بہت مشکل ہے یہ شیشہ گری ہے، شیہ
گری۔۔۔ اور پھر آئینہ ساز ہو کر بھی کم ہی لوگ ایسے ہوں گے جو سچ مچ ایسا
آئینہ ڈھال سکتے ہوں گے جس کے جلوے خود تقاضائے نگاہ بن جائیں اور بہر
نظارہ اپنے جوہر کی ہر ادبی لکیر کو مژگاں بنا دیں۔''[12]

۱۸۵۷ء سے ۱۹۰۰ء تک کا زمانہ تبلیغ ،نصیحت اور ذہنی انقلاب کے لیے جدوجہد کا زمانہ ہے۔۱۹۰۰ء سے تقریباً ۱۹۳۰ء تک رومانیت کا زمانہ رہا۔خواب خواہش اور خیال کا زمانہ،لیکن ۱۹۳۶ء کے بعد ملک میں حقیقت نگاری اور نفسیات کے مطالعہ کا جو ذوق پیدا ہوا اس کے زیر اثر خط نگاری کے آداب و رسوم نے بھی ایک نئی کروٹ لی۔ پردہ داری کی رسم ختم ہوگئی۔عورتوں کی تحریریں بھی اِکادُکا نظر آنا شروع ہوگئی تھیں۔عورت پردے کے پیچھے چھپا ہوا ایک مجہول کردار نہ رہ گئی تھی بلکہ اعلیٰ تر طبقوں کی حد تک ہی سہی ایک فرد بن گئی تھی۔اس ماحول میں عطیہ فیضی اور زہرا فیضی کے نام شبلی نعمانی کے خطوط سامنے آتے ہیں،جن کے بارے میں سیّد عبداللہ نے لکھا:

''بعض بزرگوں نے خطوط شبلی کو چھاپ کر شبلی کی اخلاقی کج روی کا ثبوت بہم
پہنچایا ہے مگر یہ بھول گئے کہ ہر زمانے کا اپنا ایک خاص مزاج ہوتا ہے۔ یہ شبلی کی
خوش قسمتی تھی کہ اس کو زمانہ اچھا ملا کیونکہ موجودہ زمانے کو تو شبلی کی یہ ادا کچھ اور
بھی بھلی لگی بالفرض اگر کوئی اور زمانہ ہوتا تو شاید شبلی کے یہ راز ان کی رسوائی کا

سامان بنتے یا بنائے جاتے۔۔۔مگراس دور میں تو یہ بے نقابیاں اور بے تابیاں
رنگین مزاج شبلی کے قصّے کو کچھ اور بھی رنگین بنا گئیں۔‘‘[13]

معین الدین احمد انصاری لکھتے ہیں:

’’عطیہ بیگم فیضی نے ان خطوط کو شائع کرنے کی اجازت دے کر ادب پر بڑا
احسان کیا اگر یہ خطوط نہ چھپتے اور ضائع ہو جاتے یا پھر عطیہ بیگم کی سیف میں
محفوظ رہ جاتے تو ان کی اہمیت کاغذ کے پرزوں کے سوا کچھ نہ رہ جاتی ۔۔۔
عطیہ بیگم نے شبلی کو جو خطوط لکھے تھے ان کا پتہ نہیں چلتا کہ وہ کیا ہوئے۔‘‘[14]

یہ بڑا اہم سوال ہے کہ خود عطیہ کے خطوط کیوں نہ چھپے۔اسے بھی زمانے کی روش ہی کہا جا سکتا ہے۔اگر عطیہ فیضی ان کے بھی چھاپنے کی اجازت دے دیتیں تو یہ ایک اور احسان ہوتا۔شبلی نعمانی خط میں عطیہ فیضی کو لکھتے ہیں:

’’قرۃ العینی! تمہارا خط مدت کے بعد ملا تو بے ساختہ آنکھوں سے لگایا اور دیر
تک بار بار پڑھتا رہا۔افسوس دیر تک ملنے کی اُمید نہیں۔میں وطن احباب آرام
سب کو چھوڑ سکتا ہوں لیکن مذہبی کام کیونکر چھوڑ دوں ورنہ بمبئی اور جزیرہ دو قدم
پر ہے۔‘‘[15]

شبلی کو عطیہ فیضی سے اُنس تھا وہ حسن و لطافت کے دلدادہ تھے اور عورت میں حسن اور علم کا اجتماع دیکھنے کے آرزومند تھے۔جو اس زمانے میں کم ہی دیکھنے کو ملتا تھا۔اس لیے عطیہ فیضی سے رابطہ شبلی کی زندگی کا ایک اہم واقعہ تھا۔مگر شبلی اپنی ذات سے اپنے نصب العین کو زیادہ اہم سمجھتے تھے۔ایک خط میں عطیہ بیگم کو لکھتے ہیں کہ میں چاہتا تھا کہ میرے کام میں تمھارے نام کی شرکت ہو اس کا اعلیٰ طریقہ یہ تھا کہ تمھارے نام ڈیڈیکیٹ کرتا لیکن افسوس نہیں کر سکتا کیونکہ جن کاموں میں گھرا ہوا ہوں تم جانتی ہو دفعتاً ان کاموں کو نقصان پہنچ جائے گا۔

عطیہ بیگم فیضی مشرق کی ان اوّلین خواتین میں سے ہیں جنھوں نے یورپ میں تعلیم پائی۔علامہ محمد اقبال سے ان کی ملاقات انگلستان میں ہی ہوئی۔اقبال سے ان کے تعلقات کی نوعیت دو معزز افراد کے تعلق کی ہے۔’’اقبال از عطیہ بیگم‘‘ میں عطیہ فیضی نے اپنی ڈائری کے اوراق کی تفصیل دی ہوئی ہے، جو قیامِ یورپ یکم اپریل ۱۹۰۷ء سے ۴ ستمبر ۱۹۰۷ء تک کی ہے۔عطیہ بیگم نے اقبال کی شخصیت کے حوالے سے ان اوراق کو قوم کی امانت سمجھا ہے۔ضیاء الدین احمد برنی لکھتے ہیں:

> ''دراصل یہ خطوط دو ایسی شخصیتوں کے باہمی تبادلہ خیالات کا عکس ہیں جو اپنے طور پر ہنگامہ پرور اور عجیب و غریب واقع ہوئی ہیں ان کی دوستی چالیس سال قبل شروع ہوئی اور آخر تک قائم رہی۔ اقبال نہ صرف انھیں نظمیں بھیجتے تھے اور ان سے تنقید کے طالب ہوتے تھے بلکہ انھوں نے اپنے مقالے بھی یونیورسٹی میں بھیجنے سے پہلے انھیں پڑھ کر سنائے تھے اور ان سے درخواست کی تھی کہ وہ ان پر تبصرہ کریں۔ چنانچہ بعض خطوں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اقبال ان تبصروں سے ایک حد تک مستفید بھی ہوئے اپنے درد دل اور سوز دروں کی کہانی اقبال نے اپنے خطوط میں انھی کو اور غالباً صرف انھی کو سنائی اور اس کی بدیہی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اقبال جانتے تھے کہ سوائے ان کے اور کوئی ہستی ایسی نہیں جو ان کے دلی جذبات کو سمجھتی ہو اور ان کی قنوطیت کو دور کر کے ان میں امید، روشنی اور سکون پیدا کر سکتی ہو۔ بہر حال دو یکساں طبیعت رکھنے والے افراد کی یہ نہ ٹوٹنے والی دوستی تھی جو خطوں کی شکل میں وقتاً فوقتاً ظاہر ہوتی رہی۔''[16]

اگر یہ کہا جائے کہ ان خطوط میں اعلیٰ انسانیت موجود ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ لیکن اگر انسانیت اور نسوانیت کہیں یکجا ہو گئی ہیں تو وہ صفیہ اختر کے خطوط ہیں جو اس نے اپنے شوہر جاں نثار اختر کو لکھے ہیں۔ صفیہ کی موت (۱۹۵۲ء) کے بعد جاں نثار اختر نے ۱۹۵۴ء میں ''زیر لب'' اور ''حرف آشنا'' ۱۹۵۸ء میں ''حرف آشنا'' کے نام سے دو مجموعے چھپوائے۔ اب زمانہ کچھ اور آگے بڑھ آیا ہے۔ یہ ترقی پسندی کا زمانہ ہے۔ نفسیات، معاشیات اور انسانیات کے علوم ایک نئی کروٹ لے چکے تھے۔ شوہر بیوی کے خطوط ایک انتہائی نجی معاملہ نہیں رہے بلکہ ایک آفاقی تعلق کی نمائندگی کرنے لگے ہیں مگر اس کے لئے صفیہ جیسی بیوی کا ہونا ضروری ہے۔ ایسی بیوی کے لیے زمانے نے ایک صدی کا چکر کاٹا ہے۔

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں   تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

ماضی قریب میں جس عورت کی آرزو کی گئی تھی۔ اس سے بھی آگے بڑھ کر ہمدم و ہم راز، مونس و غم گسار، ہم مرتبہ و ہم فکر بلکہ بوجھ بٹانے والی۔ فراق گورکھپوری لکھتے ہیں:

> ''ذاتی تعلقات اور گھریلو زندگی سے متعلق شوہر کے نام بی بی کے خطوط میں انسانیت کی اتنی قدریں، مانوسیت اور ہم آہنگی کی اتنی پاکیزہ مثالیں، اسلوب

بیان کی بے تکلفی خلوص وصداقت، نیک مزاجی و بلند کرداری کی اتنی جھلکیاں، ظرافت کا نمک، صحیح معنوں میں جیون ساتھی کا لب ولہجہ جس طرح یہ قدر راؤں کی چیزیں اس کتاب میں موجود ہیں شاید اردو یا کسی بھی زبان میں شوہر کے نام بی بی کے خطوط کے کسی دوسرے مجموعے میں نظر آ سکیں۔صفیہ اختر بیوی نہ تھی بلکہ پڑھی لکھی، گونا گوں شخصیت رکھنے والی،علم و ادب و زندگی سے مہذب انہماک رکھنے والی خاتون وطن تھی۔۔۔ یہ خطوط ایک ایسا انسانی نوشتہ یا دستاویز (Human document) ہیں جس کی مثال بسا اوقات اچھے اور کامیاب ادب میں بھی ہمیں نہیں ملتی۔ ان خطوط کی ادبیت اگر تابناک ہے تو ان کی انسانیت تابناک تر ہے۔ ہر خط میں ایک من موہنی شخصیت کا دل دھڑکتا ہوا سنائی اور دکھائی دیتا ہے۔آپ بیتی اور جگ بیتی کا سنگم ہر خط میں نظر آتا ہے۔''[17]

صفیہ کے خطوط صفیہ اور جاں نثار اختر کی شادی سے صفیہ کی موت تک کے (۹ سال) ہر لمحہ کی کہانی سناتے ہیں یکم اکتوبر ۱۹۴۳ء کو لکھا جانے والا خط ایک استفسار ہے کہ جاں نثار اختر صفیہ سے رشتہ کی بات کر کے کہاں گم ہو گیا ہے:

''آپ کو یہ اجنبی تحریر دیکھ کر حیرت ہوگی اور واقفیت حاصل ہونے پر کیا احساس پیدا ہو۔اس کا حکم نہیں لگایا جا سکتا۔ بہرحال یہ فعل اپنی جگہ پر جسارت آمیز ضرور ہے۔اس سے مجھے خود انکار نہیں کہ عملی روشنی میں اسے ایسی بڑی اہمیت حاصل نہ ہونی چاہیئے مگر رواج اور روایات کو شاید لرزہ ہی آ جائے میرا یہ اقدام دیکھ کر۔مگر کیا کروں کہ اکثر اپنے کو وہاں پاتی ہوں جہاں پگھلی ہوئی زنجیر آئین قدامت کی۔''[18]

''شوہر کا تصور اب میرے لیے ایک دیوتا کا تصور نہیں ایک دوست کا تصور ہے لیکن ایک ایسے دوست کا تصور جو مجھ سے بہت سی باتوں میں فوقیت رکھتا ہو۔ خیالات میں ارادوں میں عمل میں اور پھر اس فوقیت کو تسلیم کرنے میں مجھے ایک ابدی سکون حاصل ہوتا ہے۔''[18]

''کیا میرے دن یونہی کٹ جائیں گے؟ کیا میں ہمیشہ یونہی تنہا رہوں گی جاوید

نہ ہوتا تو اب زندگی ناممکن ہو جاتی اختر۔ میں کیا کروں کہ مجھے ہر لمحے یاد آتے ہو اور میں تمھارے بغیر زندہ رہ کر کل دنیا سے ایسی شرمندگی محسوس کرتی ہوں جیسے کسی گناہ کا ارتکاب کر رہی ہوں اور پھر اندر اندر نہ جانے کیا شے بجھتی چلی جاتی ہے۔ دراصل میں زندہ ہی نہیں رہتی ہوں اختر۔'' [18]

''اختر تم مجھے خط ضرور لکھتے رہا کرو ان سے مجھے زندگی میں ایک تازہ قوت محسوس ہوتی ہے میں تمھارے ایک خط کے سہارے کئی دن زندگی گزار لیتی ہوں مجھے اپنے خطوں سے تو نہ ترساؤ۔'' [18]

''مجھے یہی احساس رہا کہ تمھیں آئندہ کی پریشانیوں سے تحفظ دے سکوں میں نہ تم سے الگ رہنا چاہتی ہوں نہ میرے لئے یہ ممکن ہے میری سوگوار زندگی اس کی شاہد ہے۔'' [18]

''اختر آؤ تم مجھے مرنے نہ دو میں مرنا نہیں چاہتی البتہ میں تھک گئی ہوں۔ ساتھی آؤ میں تمھارے زانو پر سر رکھ کر ایک طویل نیند لے لوں۔ پھر تمھارا ساتھ دینے کے لیے میں ضرور ہی اٹھ کھڑی ہوں گی۔ میرے بے شمار پیار تم پر نچھاور ہیں۔۔۔ایک بار مجھے اپنی صورت تو دکھاؤ جنوری میں ہی ضرور آ جاؤ۔ اس سے زیادہ مجھ میں انتظار کی سکت نہیں ساتھی۔ دو دن بعد ہماری شادی کی نویں سالگرہ ہونے والی ہے اختر مجھے تمھارے پیار کا تحفہ درکار ہے کیا تم میری آشا پوری کرو گے۔'' [18]

''تم کیا کر رہے ہو گے ہوٹل کی چائے اور ہوٹل کا کھانا۔ عید کے دن بھی کیا ظلم ہے، میرے اللہ۔ یوں تمھارے ساتھ نہ سہی مگر ذہنی طور پر تم سے ایک لحظہ کے لئے الگ نہیں ہوں۔ آؤ تمارے گلے میں ہاتھ ڈال کر تمھارے سینے پر دو چار گرم آنسو ڈھلکا دوں۔ میری عید ہو جائے گی۔'' [18]

''بہر حال جس طرح ہو اور جس کیفیت میں ہو میں تمھاری شریک ہوں۔ تمھارے غم کی اتنی ہی جتنی تمھاری خوشی کی۔ مجھے یہ جاننے کی ضرورت نہیں کہ تم

کس راستے پر جارہے ہو مجھے اتنا معلوم ہے کہ جس طرف بھی جارہے ہو۔ میں تمھارے ساتھ ہوں البتہ اختر اس کے بعد مجھے اتنا اختیار ضرور دو کہ اگر تباہی کے غار کی طرف بڑھ رہے ہوتو میں تمھارا ہاتھ پکڑ کر روک سکوں۔'' [19]

صفیہ نے اپنی زندگی کا آخری خط ۲۹ر دسمبر ۱۹۵۲ء کو تحریر کیا۔

''میں تمھارے لیے ہی پیدا کی گئی تھی۔ تمھارے انتظار میں زندہ رہی۔ پروان چڑھی اور مرتے دم تک تمھاری ہی رہوں گی۔ میرے لیے تم ہی سب کچھ ہو۔ میری عزت کے محافظ، میرے بچوں کے نگران، میرے دوست، میرے ساتھی، رفیق اور پھر ایک ہندوستانی عورت کے ساجن'' [19]

واقعتاً یہاں ایک ہندوستانی عورت اپنے تمام رکھ رکھاؤ اور خود سپردگی کے ساتھ جلوہ آرا ہے۔ اردگرد فرش پر چاندنیاں بچھی، ہیں تخت پوش ہیں، موتیے کی کلیاں ہیں۔ گرمی ہے، سردی ہے، سرخ بلاؤز اور ساڑھیاں ہیں، نوکر، بچے، جاوید اور اویس کی معصوم شرارتیں ہیں اور ایک مجبور شوہر پرست بیوی کے متلاطم جذبات ہلکورے لیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ محبوب کی یاد میں صفیہ کی تحریریں، قدیم شاعری کو تازہ کرتی ہیں۔ اب غم جاناں کے ساتھ ساتھ غم دوران نے بھی ہجر کی ماری عورت کو دبوچ لیا ہے۔ قدیم ہندی شاعری میں مرد محبوب ہے اور عورت اس کے گرد گھومتی محسوس ہوتی ہے۔ اس جذبے کو جس خلوص پاکیزگی اور نسائی خوبصورتی سے صفیہ نے ادا کیا ہے وہ صرف اسی کا حصہ ہے لیکن یہاں جدید زمانے کی ایک عورت بھی جلوہ ریز ہے۔ جس نے اپنی بساط سے زیادہ بوجھ اٹھا لیا ہے اور اسے سانس لینا بھی دوبھر ہو گیا ہے۔ جاں نثار سوائے بھوپال کے دو سال کے قیام کے ہمیشہ صفیہ سے دور دوسرے شہروں میں مقیم رہے جب کہ صفیہ علی گڑھ یونیورسٹی میں ملازمت کرتی رہیں۔

''تم نے استعفیٰ دیدیا اچھا کیا ایک طویل ذہنی کشمکش کا خاتمہ یونہی ممکن تھا۔ اگرچہ دوسری جانب بھوپال کی زندگی کی سہولتیں اور کالج کی ملازمت کشش انگیز تھی۔ میری طبیعت کی کمزوری سمجھو یا کچھ بھی میرے لیے یہ فیصلہ مشکل ہوتا۔ تمھیں کل ہی پیسے روانہ کردوں گی۔ تمھیں اس طرف سے واقعتاً سخت تکلیف ہوگی۔ بے تکلف ہر ضرورت اور ہر پریشانی سے مطلع کرتے رہنا اور خود کو کسی طرح متاثر نہ کرنا۔ کہاں ہو کیسے ہو کچھ بھی تو نہیں معلوم بھائی رشید کی معرفت یہ

اطلاع پہنچی تھی کہ تم بھوپال چلے گئے۔ یہ خیال کرنے کو ایک لمحے کو دل نہیں چاہتا کہ تم اس پُر آشوب زمانے میں مجھ سے اس درجہ بے تعلق و بے خبر ہو سکتے ہو کہ خط تک نہ لکھو۔ بہر حال ہر چیز برداشت کرنی ہے۔ مرنا بھی چاہوں تو بچے دامن پکڑتے محسوس ہوتے ہیں ان بے گناہوں نے کیا قصور کیا ہے جو میری بدنصیبی کی سزا جھیلیں۔'' [20]

''جی چاہتا ہے کہ تم سے باتیں کرتے وقت تمھارے علاوہ سب کچھ بھول چکی ہوں گی آجکل غم روزگار غم عشق کے برابر ہی شدید معلوم ہو رہا ہے۔ سیاسی فضا کے تکدر نے ذہن کو ماؤف کر رکھا ہے۔ میں تو بہت کچھ مضبوطی سے دن گزارتی ہوں مہلت ہی کہاں ہے جو چیزوں کی اہمیت پر غور کروں۔ البتہ تمام لوگ علی گڑھ کے پوری پوری رات جاگ کر گزارہ کرتے ہیں دو ایک دن تو یہ مشکل تھی کہ ہر لمحہ یہی اندیشہ ہوتا تھا کہ اب یونیورسٹی پر شہر والوں نے حملہ کیا۔۔۔ اس حالت میں بھی اپنے بیمار بچے کو لے کر نوکر کے ساتھ شہر گئی ڈاکٹر کو دکھانے۔ سڑک پر گورے سپاہیوں کا پہرہ تھا۔ مشین گن والی لاریاں مستقل چکر لگا رہی تھیں۔'' [20]

صفیہ کے خطوط طرح طرح کی کہانیاں سناتے ہیں ہندوستان کی تقسیم اور اس سے پہلے اور بعد کے حالات۔ ایک شاعر کی اُفتادِ طبع اور اس کی بیوی کو پیش آنے والی دشواریاں۔ ملازمتی مسائل، ہم عصر ہندوستان کے سماجی، سیاسی حالات اور سب سے بڑھ کر اور اس سب کے باوجود اپنے شوہر کے لیے انتہائی خوبصورت احساسات کا مرقع ہیں۔

میاں بیوی کے تعلق خاص کے مظہر خطوط لکھنے والی ایک اور خاتون اپنی ایک مستقل ادبی حیثیت پہلے سے ہی رکھتی تھی۔ میری مراد امرتا پریتم سے ہے۔ امرتا نے اپنی خود گزشت ''رسیدی ٹکٹ'' کے نام سے پبلک تک پہنچا دی تھی۔ ''محبت نامے'' (مجموعہ خطوط) کو بھی 'رسیدی ٹکٹ' ہی کا دوسرا ایڈیشن سمجھنا چاہیے۔ ان خطوط میں امرتا کی محبت کا موضوع فن کار اندرجیت ہے۔ جس کا فلمی نام امروز ہے امرتا اسے ایمی، ایموا، ایما جیتی کئی ناموں سے پکارتی ہے۔ یہ وہ باشعور عورت ہے جسے اپنی صلیب خود اٹھانا ہے، اپنے شوہر امروز کو ایک خط میں لکھتی ہے:

''میں ساری زندگی تصور کے گیت لکھتی رہی لیکن میں جانتی ہوں میں وہ نہیں ہوں جسے کوئی اس طرح سے آواز دے اور میں یہ بھی جانتی ہوں تم وہی ہو جسے

میں یہ آواز دے رہی ہوں اور یہ بھی جانتی ہوں میری آواز کا کوئی جواب نہ
آئے گا۔'' [21]

ایک عورت جو آزادی سے ساحر سے محبت کر سکتی ہے اندر جیت (امروز) سے شادی کر سکتی ہے ایک بڑی ادیب ہے شاعر ہے غیر ملکی دورے کرتی ہے۔ رسائل کی روح رواں ہے۔ اردو پنجابی میں بے شمار کتابیں لکھتی ہے۔ آرٹ کی دلدادہ ہے، اپنی آزاد روح کے لیے اپنے شوہر اپنے محبوب کو ہی علامت مانتی ہے۔

''ایک پرائے دیس سے تمھیں خط لکھتے وقت یاد آیا کہ آج ۱۵/اگست ہے
ہمارے دیس کی آزادی کا دن اگر کوئی انسان کسی شے کی علامت بن سکتا ہے تو
میں یہ کہنا چاہوں گی کہ تم میرے ۱۵/اگست ہو، میرے وجود اور میرے قلب کی
آزادی کا دن۔'' [21]

''جان جیتی!
تمھارے بہت پیارے خط ملے اتنے پیارے کہ زندگی میں ایمان پیدا ہو جائے
اسی قدم قدم پر زندگی سے ایمان ختم کر دینے والی دنیا میں تم، تمھاری ذات،
تمھارے خطوط زندگی کی رحمت ہیں۔ ورنہ دنیا کے ظلم کی کہانی کتنی طویل ہے یہ
میں بھی جانتی ہوں اور تم بھی۔'' [21]

''جیتی! جتنی سبزیاں دے گئے تھے سب ختم ہو گئی ہیں جتنے پھل دے گئے تھے
وہ بھی ختم ہو گئے ہیں۔ فرج خالی پڑا ہے لگتا ہے میری زندگی بھی خالی ہوئی جا
رہی ہے۔ جسم پر ایک پسینہ دھوپ کا ہے اور ایک تمھاری عدم موجودگی
کا۔'' [21]

جیتی! اگر وہاں کام کا کوئی مستقبل دکھائی دیتا ہو تو ضرور سٹرگل کرو لیکن ناحق نہ
بھٹکنا یہاں گھر بیٹھ کر یہیں سوکھی دال روٹی بھی بہت ہے (آج میں اسی برس کی
یا پچھلے کسی زمانے کی عورت کی طرح باتیں کر رہی ہوں۔ شاید غیر فانی عورت
ایسی ہی ہوتی ہے۔)'' [21]

یہ عورت صفیہ سے کس قدر قریب آ جاتی ہے جب کہتی ہے:

''اوے میرے ایما! اگر کسی دن مجھے تمھارے بغیر جینا پڑا تو ایشور سے بھی کہہ دوں گی نہیں تمھارے بغیر لاچار ہو کر جینے سے بالکل انکاری ہوں اگر زندگی سے زندگی کو نکال دیں تو باقی جو کچھ بچتا ہے وہ مجھے نہیں چاہیے۔ کل رات کا تمھارا فون میری سانسوں میں جان ڈال گیا۔ یورپ کی کوئی بات نہیں اگر بمبئ میں ہمیں کوئی مستقبل دے سکتے ہو تو وہی ٹھیک ہے۔'' [21]

یہ خطوط امرتا کے شوہر امروز نے مرتب کئے ہیں اور تصویر کا صرف ایک رُخ دکھاتے ہیں۔ دوسرے رُخ کے لئے باقی آدھی کتاب مخصوص ہے، جس میں خود امروز کے خطوط ہیں، امروز کہتے ہیں:

''امرتا کے خطوط مرتب کر چکا تو اب وہ کہہ رہی ہے دیکھو امروز یہ واقفیت نامکمل ہے۔ کافکا کی محبوبہ پر لکھی ایک کتاب کے دیباچہ میں آرتھر کوئسلر کہتا ہے کافکا کے خطوط تو مل گئے لیکن ملینا کے خطوط کے بغیر اس کی پورٹریٹ نامکمل ہے۔ وہ ملینا کے خطوط کو میرے جلتے سر پر بارش کی بوندیں کہا کرتا تھا اور وہ بارش کی بوندیں نہیں مل رہیں۔'' [21]

اس لئے ملیناؤں کے خطوط کے بغیر ''خطوط شبلی''، ''دامن یوسف'' اور ''عفت ذکی'' کے نام فیض احمد فیض کے خطوط کی کہانی ادھوری رہے گی۔

فیض احمد فیض اردو شاعری کا ایک بڑا نام ہیں جو خطوط انھوں نے اپنے دوستوں کے نام لکھے ان میں سے دو خواتین نے ان کے چھپانے کا اہتمام کیا۔ ایک ملتان سے عفت ذکی ہیں ان کے نام خطوط ششماہی رسالے ''غالب'' میں چھپے (۳۵ غیر مطبوعہ خطوط) جن کے بارے میں مرتب نے کہا کہ:

''ان خطوط کی سب سے بڑی اہمیت تو یہ ہے کہ یہ فیض کے ایسے خطوط ہیں جو کاروباری یا رسمی نہیں ہیں یہ ہمارے عہد کے ایک بڑے شاعر کی ذہنی و قلبی کیفیات کے آئینہ دار ہیں اور شاعر کی زندگی اور سوچ کے بعض ایسے پہلوؤں کو سامنے لاتے ہیں جو اب تک عام نظروں سے اوجھل تھے۔'' [22]

یہ پینتیس خطوط فیض کے عفت سے تعلق خاطر کی کہانی تو سناتے ہیں لیکن حسب روایت خود عفت کے خطوط منظر عام پر نہیں آئے ان خطوط کے بارے میں عفت کہتی ہیں:

''فیض صاحب کے چند خطوط اور بکھری بکھری سی یادیں ان کو کیسے یکجا کروں۔ (فیض صاحب نے ایک دفعہ لکھا تھا) دوستی کوئی قرض نہیں جس کا تقاضا کیا جا سکے نہ یہ کوئی خونی یا قانونی رشتہ ہے جس کے منقطع ہونے کی شکایت کی جائے اگر کسی کا دل بھر جائے تو صبر کر لینا چاہیے، بخدا میں آپ کے سامنے اقرار کرتی ہوں کہ فیض صاحب کی دوستی سے جی بھرا نہیں تھا۔''[23]

فیض ہی کے خطوط کو بیگم سرفراز اقبال نے زیادہ بلند آہنگ انداز میں ''دامنِ یوسف'' کے نام سے شائع کروایا ہے، پیش لفظ میں لکھتی ہیں:

''میں ان خطوط کو شائع کرانے کا ارادہ نہیں رکھتی تھی کہ یہ میری ذاتی دولت تھی اپنی دولت سے کون محروم ہونا چاہتا ہے۔ یہ فیصلہ کرتے ہوئے میں نے سوچا تھا کہ فیض جیسے لوگ ان کے اصول اور ان کے نظریات ان کی سوچیں ان کی خواہشیں، ان کی بزم اور ان کی تنہائیاں کہی اور ان کہی باتیں جب یہ سب کچھ ان کا ذاتی نہیں ہوتا کہ یہ لوگ مجسم قوم کی امانت ہوتے ہیں تو پھر میں کیسے ان کی عقیدت میں گزارے ہوئے لمحوں کو اپنی ذاتی دولت قرار دے سکتی ہوں کہ خوشبو کو مٹی میں کس نے بند کیا ہے اور چاند کی روشنی صرف میرے آنگن کی اسیر تو نہیں رہ سکتی۔''[24]

لیکن افسوس کہ بیگم سرفراز اقبال نے بھی اپنے خطوط جو انھوں نے فیض صاحب کو لکھے ہوں گے، نہیں چھپوائے۔

اُردو خطوط کی ادبی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو مردوں کے خطوط کے بے شمار مجموعے مل جاتے ہیں۔ خود ''نقوش'' نے دو نہایت گراں قدر خطوط نمبر شائع کئے، جن میں ۲۲۵۳ غیر مطبوعہ خطوط شائع کئے گئے۔ جن میں سے صرف ۱۴ خاتون خطوط نگاروں کے (۵۰) خط شامل ہیں۔ اس کی دو وجوہات ہیں ایک تو یہ کہ معاشرتی زندگی میں عورتوں کو کوئی درجہ حاصل نہ تھا۔ گھریلو عورت کے نام اور آواز تک کو پردہ تھا۔ دوسرے یہ کہ معاشرتی زندگی سے اس دوری کے نتیجے میں وہ پڑھنا لکھنا بھی نہ جانتی تھیں۔ چنانچہ نقوش خطوط نمبر کے پہلے سو سال کے خطوط میں عورتوں کا کوئی خط شامل نہیں ہے بلکہ مردوں کے خطوط میں بھی عورت کا کسی بھی حوالے سے کسی بھی رشتے سے کوئی حوالہ موجود نہیں ہے۔ تقریباً بیسویں صدی کے آغاز میں عورتوں کی تحریروں کا ذکر سننے پڑھنے میں آتا ہے۔ رومانوی تحریک

کے زمانے میں ملگجی سی روشنی میں وہ والدہ فلاں بنت فلاں کے نام سے لکھنے لگتی ہے۔ یہ ترقی پسند تحریک کا زمانہ ہے جس نے سارے پردے اٹھا کر عورت کے بارے میں اور خود عورت کو معروضیت کے ساتھ سوچنا سکھایا ہے۔

چنانچہ یہ ترقی پسند تحریک کے زمانے کی عورتیں ہیں جن کے لکھے ہوئے خطوط منظر عام پر آئے مثلاً نذر سجاد حیدر، رضیہ سجاد ظہیر، بیگم حسرت موہانی، بیگم بہادر یار جنگ، بیگم پطرس، عصمت چغتائی، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، قرۃ العین حیدر، ممتاز شیریں، تسنیم سلیم چھتاری، بیگم مہدی افادی اور بیگم جہاں آرا شاہنواز، شائستہ اختر سہروردی، صالحہ عابد حسین، جہاں بانو، صغرا ہمایوں مرزا، صفیہ اختر۔ ان خواتین کے خطوط کو پہلی دفعہ باقاعدہ ایک مجموعے کی صورت میں دینے کا اعزاز ربیعہ سلطانہ نے حاصل کیا۔ یہ مجموعہ ''مکاتیب جمیل'' کے نام سے ۱۹۵۶ء میں مکتبہ جدید، لاہور سے شائع ہوا۔ اس مجموعے میں (۴۸) خواتین کے خطوط شامل ہیں جو کسی نہ کسی طرح قلم سے وابستہ ہیں۔ اس مجموعہ خطوط کا دیباچہ ڈاکٹر عندلیب شادانی اور مولوی نصیر الدین ہاشمی نے لکھا۔ مولوی صاحب لکھتے ہیں:

> ''اگر کہیں عورتوں کو تعلیم دی جاتی تھی تو ان کو لکھنا نہیں سکھایا جاتا تھا۔ دنیا بدلنے لگی جو پہلے عیب تھا وہ اب ہنر بننے لگا جو باتیں پہلے معیوب تصور کی جاتی تھیں وہ مستحسن سمجھی جانے لگیں۔ اوّلاً تعلیم نسواں کی اہمیت اور ضرورت پر زور دیا گیا۔ بڑی مخالفت اور دشواریوں کے بعد آخر تعلیم نسواں کی ضرورت کو تسلیم کر لیا گیا۔ مخالفین نے خاموشی اختیار کر لی۔ اس کے بعد ایک قدم اور بڑھا۔ مردوں کے ایک گروہ نے عورتوں کی حمایت میں کمر ہمت چست کی۔ قلم ہاتھ میں لے کر ادب برائے نسواں مرتب کرنے لگے۔ عورتوں کی طرف داری اور جانبداری میں کتابیں اور مضامین لکھے۔ درودل کو الفاظ کا جامہ پہنایا گیا۔ عورتوں کے خیالات اور جذبات کی ترجمانی کی جانے لگی۔ ان کی جانب سے فرضی خطوط میں ان کا حال زار بتایا جانے لگا۔ جنس نازک پر سماج کی جانب سے جو سختیاں ہوئی تھیں ان کی داستانیں مرتب ہوئیں۔ ان کی بیچارگی کے افسانے پیش کئے گئے، ان کی مظلومیت پر آنسو بہائے گئے۔''[25]

اس مجموعے میں شامل خواتین کے خطوط کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ خواتین سماجی زندگی کے بہت سے مراحل طے کر چکی ہیں۔ ان خطوط کے مطالعے سے خواتین کے کچھ طبقات بھی سامنے آتے ہیں ایک تو طبقہ اعلیٰ ہے جو موعودہ

منزل تک پہنچ چکا ہے اور اس کی نمائندگی بیگم جہاں آرا شاہنواز کر رہی ہیں۔ ہندوستانی اسمبلی کی ممبر ہیں اور انگلستان میں اپنی سیاسی مصروفیات اور تقریروں کا حال سرشار لہجے میں ایک خط میں اپنی بہن کو سنا رہی ہیں:

''(۱۹۳۰ء۔ برطانیہ) شام کو تمام اخباریں تمھاری آپا کی تصویر اور تقریر سرورق پر لئے ہوئے تھیں سیکرٹری آف سٹیٹ تمام راجا اور نواب کرسیاں چھوڑ کر مبارکباد دینے آئے۔ تمھاری آپا اس ہجوم میں جھجک کر کھڑی تھی۔ چہرہ تمتما رہا تھا۔ ایک ایک سے ہاتھ ملا کر شکریہ کہہ رہی تھی۔ سمجھ لو میرے گھر پہنچنے سے پہلے والدہ صاحبہ کو سیکرٹری آف سٹیٹ کا مبارکباد کا خط پہنچا۔ جو انھوں نے اسی وقت لکھا تھا، مل چکا تھا۔ تمام انگلستان سے خطوط، لڑکیوں کے کالج سے تاریں اور امریکہ سے تاریں مبارکباد کی آتی ہیں۔ اب تک چھ تقریریں کر چکی ہوں۔ ہندو صلح کو تیار ہیں ان کا ارادہ کانفرنس چھوڑ کر چل دینے کا ہے صرف بہانہ ڈھونڈ رہے ہیں گورنمنٹ کا روّیہ قابل قدر ہے۔''[26]

سیاسی مصروفیات کے ساتھ ساتھ ان کے طبقے کی حسین مصروفیات بھی ان خطوط میں منعکس ہیں:

''رات گرم تھی ہلکی ہلکی چاندنی میں مس اسماعیل مرزا نے گا کر سنایا۔ بچی بہت شریف پیاری اور تعلیم یافتہ ہے۔ لیڈی اسماعیل مرزا بہت ملنسار ہیں۔ لیڈی حیدری ان کی بہو لیڈی اسماعیل مرزا ان کی لڑکی بیگم مہدی یار جنگ، مسز سوبرائن اور ہم اکثر وقت مل کر گزارتے ہیں۔ ہاں سردارنی اجل سنگھ بھی ہمارے ساتھ رہتی ہیں۔ اس سفر میں سر اکبر حیدری کے خاندان سے دل کھول کر ملنا ہوا۔''[27]

بیگمات کہلانے والی عورتوں کی بھی اپنی ذہنی زندگی ہوسکتی ہے تسنیم سلیم چھتاری کے خط کے اقتباس سے اندازہ ہوسکتا ہے:

''بڑی خوشی کی بات ہے کہ آپ میری انسانیت کی قدر کرتے ہیں ورنہ نواب صاحب چھتاری کا نام لے کر جو کچھ جی حضوری ہوتی ہے وہ میرے لیے نہ فخر کا باعث ہے نہ اطمینان کا۔ آپ نے میرے خیالات کو اچھی نظر سے دیکھا اس لیے دل چاہتا ہے کہ آپ سے بہت کچھ کہوں ورنہ مجھے تو اس کا احساس بھی رہا

ہے کہ نہ میں کسی سے کچھ کہہ سکتی ہوں اور نہ کوئی میری بات سن سکتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ انسان کو دو قسم کی بھوک لگتی ہے۔ ایک وہ جس سے ہمارے ہاتھ پیروں کی قوت کا تعلق ہے اور دوسری وہ جس کا تعلق ہماری روح سے ہے۔ ایک نوابزادی کو پہلی قسم کی بھوک سے پریشان ہونے کا موقع نہیں ملتا۔ مگر فطری طور پر جب وہ پیٹ بھر کر کھانا کھالیتی ہے تو اس کا دل یہ ضرور چاہتا ہے کہ اسے قلبی سکون اور ذہنی مسرت کا حصول ہو اور یہ چیز میں نے دیکھا کہ محلات میں مجھے نہیں ملی۔ ہاں اب ضرور حاصل ہے۔ جب آپ نے میرے دماغ کو متوازن اور خیالات کو اچھا سمجھا۔ جب تک میں کم سن تھی میں نے اپنے ماحول کی آسودگی سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا اور کبھی کسی خواہش کی ناکامی سے واسطہ نہیں پڑا۔ مگر جب میں نے سمجھ دار ہو کر چار دیواری سے باہر نظر ڈالی تو مجھے احساس ہوا کہ ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں، جہاں ان کی قدر ہے۔ جو ہوائی جہاز کی بجائے اپنے خیال کے بازوں سے بلند پروازی کریں۔''[28]

چنانچہ خیال کے بازوں سے بلند پروازی کرنے والی خواتین کی اس وقت تک ایک بڑی کھیپ سامنے آ چکی تھی جو بلند پروازی ہی نہیں جہالت، غربت، ناانصافی، استحصال کے خلاف اپنے قلم سے جہاد شروع کر چکی تھیں۔ ان کی تحریروں نے اعتبار حاصل کیا تو ان کے خطوط بھی معتبر ہوئے اور قابل اشاعت قرار پائے۔ قابل مطالعہ ٹھہرے۔ محمد طفیل (نقوش، خطوط نمبر) نے لکھا تھا:

''خطوط صرف ادب و انشاء ہی کے آئینہ دار نہیں ہوتے بلکہ اس سے علمی و ادبی سماجی اور سیاسی تاریخیں مرتب کی جا سکتی ہیں۔۔۔ اور میری اس کاوش سے سوسالہ علمی و ادبی سماجی اور سیاسی تاریخ مرتب کی جا سکتی ہے۔''[29]

اسی طرح ربیعہ سلطانہ کے نسوانی خطوط کے اسی مجموعے سے بھی بہت کچھ اخذ کیا جا سکتا ہے۔ اہم ادبی خواتین کے ذاتی حالات، مصروفیات، ادبی رجحانات، مختلف ادبی تحریکوں کے اثرات وغیرہ۔ اگر ہم عصر ادبی خواتین کے خطوط کے کچھ اور مجموعے شائع ہو جائیں تو ادبی تصنیفات کے ساتھ ساتھ ان کے نجی حالات و رجحانات ادبی تاریخ کے لئے محفوظ ہو سکتے ہیں۔

حوالہ جات

1- محمد اکرم چغتائی (مرتبہ) تاریخ مشغلہ، پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی، لاہور ۱۹۸۵ء، ص ۱۵-۱۶

2- خواجہ احمد فاروقی، ڈاکٹر کلاسیکی ادب، دہلی، ص ۱۲۴

3- ڈاکٹر محمد باقر (مرتبہ) تاریخ ممتاز، اردو مرکز، لاہور، مارچ ۱۹۵۲ء، ص ۵

4- گارساں دتاسی ''ہندوستانی ادب ۱۸۷۵ء میں''، جلد اوّل، حصہ دوئم، مطبوعہ انجمن ترقی اردو ہند، دہلی ۱۹۴۳ء، ص ۱۴۳-۱۴۴

5- منشی سیّد احمد دہلوی ''ہادی النساء''، مجلس ترقی ادب، لاہور، بار ہفتم ۱۹۷۳ء، ص ۴۸

6- اکبر حیدری کشمیری۔ مضمون ''اردو اخبار اور سرسید''، رسالہ 'صحیفہ' لاہور، جنوری مارچ ۲۰۰۲ء، ص ۳۳

7- مولوی نذیر احمد۔ ''مراۃ العروس''، جمال پرنٹنگ ورکس، دہلی، ص ۱۷

8- مولوی نذیر احمد۔ ''ایامیٰ''، مطبع فیض، دہلی، ص ۱۲۴

9- فرمان فتح پوری، ڈاکٹر ''قمر زمانی بیگم''، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، بار دوم ۱۹۷۹ء، ص ۱۵۰

10- سجاد حیدر پرویز۔ ''اردو افسانے کے فروغ میں ساقی کا کردار''، غیر مطبوعہ مقالہ برائے پی ایچ ڈی، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان، ص ۹۰-۹۲

11- قاضی عبدالغفار ''لیلیٰ کے خطوط''، فرینڈز پبلشرز، کراچی، بار اوّل ۱۹۸۲ء، ص ۷

12- سیّد عبداللہ، نقوش، شمارہ ۶۵-۶۶، خطوط نمبر، ادارہ فروغ اردو، لاہور، ص ۱۸

13- ایضاً، ص ۳۰

14- معین الدین احمد انصاری ''شبلی مکاتیب کی روشنی میں''، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ص ۲۶۰-۲۶۲

15- سیّد سلیمان ندوی (مرتبہ) ''مکاتیب شبلی'' حصہ اوّل، معارف اعظم گڑھ، ص ۲۲۳

16- ضیاء الدین احمد برنی ''اقبال از عطیہ بیگم'' (تمہید، ص ج) اقبال اکیڈمی، کراچی ۱۹۵۶ء

17- صفیہ اختر (فراق گورکھپوری۔ دیباچہ) ''زیر لب''، نیا ادارہ، لاہور، بار سوم ۱۹۷۶ء، ص ۷-۸

18- صفیہ اختر۔ حرف آشنا، نیا ادارہ، لاہور، بار سوم ۱۹۷۳ء، ص ۱۵، ۱۸، ۹۷، ۱۵۱، ۲۰۷، ۲۷۰، ۹۹

19- صفیہ اختر ''زیرِ لب'' ص۱۱۴،۷۴

20- صفیہ اختر ''حرفِ آشنا'' ص۱۸۸،۱۵۳،۱۵۴

21- امرتا پریتم ''محبت نامے'' ص۲۹،۴۹،۷۲،۷۸،۷۴،۸۳،۸۷

22- رسالہ غالب،شمارہ (۶-۱۰)،ادارہ یادگارِ غالب،کراچی،۱۹۹۲ء،ص۵۰

23- عفت ذکی (مضمون) ''فیض خطوط کے آئینے میں'' یادِ فیض،مکتبہ قاسم،ملتان۱۹۸۶ء،ص۲۰

24- بیگم سرفراز اقبال (دیباچہ) ''دامنِ یوسف'' ماورا پبلشرز،لاہور

25- ربیعہ سلطانہ۔ ''مکاتیبِ جمیل'' ص۱۶،مکتبہ جدید،لاہور،۱۹۵۶ء

26- ایضاً، ص۳۹

27- ایضاً، ص۴۱

28- ایضاً، ص۱۷۹-۱۸۰

29- محمد طفیل (اداریہ) نقوش،ادارہ فروغ اردو،لاہور،شمارہ نمبر۶۵-۶۶